

# تعدّد ازواج اور اسلام

(۴)

## ایک مطالعہ

عمر احمد عثمانی

اس مضمون کی پچھلی اشاعت میں تعدّد ازواج کے سلسلے میں قرآن کریم کی مختلف آیات کریمہ سے ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ قرآن کریم کا اپنا رجحان تعدّد ازواج کی طرف نہیں بلکہ وحدت ازواج ہی کی طرف ہے اور اس لئے یہ بات جو مشہور ہو گئی ہے کہ اسلام تعدّد ازواج کا حامی ہے اور اس کے نزدیک ہر شخص کو عام حالات میں بھی کئی کئی شادیاں کرنے کا حق حاصل ہے ایک ایسی تہمت ہے جس کا قرآن کریم متحمل نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں ہم نے سورہ نساء کی مشہور آیت (۳۴) یعنی وَذُنْ حَفْصَةُ اَلَا فَتَقْصِبْ سَطْرًا فِي الْيَتَامَىٰ فَاَنكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مِمَّنْ سَنَىٰ وَثَلَاثٌ وَّمِزْجٌ وَاوْرَاكُم مِّنْ

یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں کر سکو گے تو ان میں سے جو عورتیں تمہارے لئے پاکیزہ (حلال) اور پسندیدہ ہوں، تم ان سے نکاح کر لو، دو، تین، چار چار) پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ آیت کریمہ مسلمانوں کے عام حالات سے تعلق نہیں رکھتی، جیسا کہ عموماً سمجھ لیا گیا ہے۔ بلکہ اس آیت کا تعلق مسلم معاشرہ کے ان خصوصی حالات سے ہے جبکہ تعدّد ازواج کے بغیر یتیم اور یرہ عورتوں کے ساتھ سماجی اور معاشرتی انصاف کا سلوک نہ کیا جاسکتا ہو اور ان کا تحفظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان کے تباہ حال اور ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ آیت کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہے کہ اس

سلسلہ کی مذکورہ ہدایات یتامیٰ سے متعلق ہیں اور اسی سلسلہ کلام میں یہ آیت بھی آئی ہے جتنی کہ اس آیت کریمہ کی ابتدا بھی خود یتامیٰ ہی کے تذکرہ سے ہوئی ہے اور اس میں تعدد ازدواج کی اجازت کو بھی اس شرط کے ساتھ مشروط فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یتامیٰ کے ساتھ تعدد ازدواج کے بغیر سماجی اور معاشرتی انصاف کا سلوک نہیں ہو سکے گا، انہیں مناسب تحفظ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کے صلئے ہو جانے کا اندیشہ لاحق رہے گا تو تمہیں ان میں سے یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کر لینے کی اجازت ہے کہ اس طرح وہ تمہارے اپنے گھر اور خاندان کا فرد بن جائیں گی اور ان کی نگہداشت اور خبر گیری کرنا محض ایک اخلاقی اور دینی فریضہ ہی نہیں رہے گا بلکہ ایک خانگی اور خاندانی ضرورت بھی بن جائے گا۔ اگر جنگ وغیرہ کی وجہ سے معاشرہ میں ایسی عورتوں کی تعداد بڑھ گئی ہو تو اس کا حل بھی نکل آئے گا۔ ادویوں یہ یتیم اور بیوہ عورتیں خود اپنے معاشرہ ہی میں کھپ سکیں گی۔

بہر حال اس آیت کا مقصد ایسے حالات میں تعدد ازدواج کی اجازت دینا ہے جبکہ اس کا مقنا یتیم اور بیوہ عورتوں کو سماجی اور معاشرتی تحفظ عطا کرنا ہو۔ یتامیٰ کے معنی عربی زبان میں محض چھوٹے چھوٹے بے باپ کے بچوں ہی کے نہیں ہوتے جیسا کہ ہمارے ہاں سمجھ لیا گیا ہے بلکہ یتامیٰ سے مراد بن باپ کی ناکندہ بالغ لڑکیاں اور بیوہ عورتیں بھی ہوتی ہیں اور وہی اس آیت میں مراد ہیں۔ اس کے بعد ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اس مضمون کی دوسری قسط میں یہ سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ عربی زبان میں یتامیٰ سے مراد اسی قسم کی عورتیں کیوں ہیں جو باپ یا شوہر کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے اس بھری دنیا میں بے سہارا اور بے آسرا رہ گئی ہوں؟ اس سلسلہ میں عربی زبان کے مشہور امام لغت علامہ محمد بن ابوالفیض سید مرتضیٰ حسینی زبیدی، رح کی تصدیقات قابل غور ہیں علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ

وقال ابو سعید یقال للمرأة یتیمۃ لایزول  
عنها اسم الیتیم ابدًا۔ وانشدوا  
وینکح الایام الیتامی

الوسعید نے کہا ہے کہ عورت کو ہمیشہ یتیمہ کہا جاتا ہے  
اور اس یتیمی کا لقب کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتا اس کے  
ثبوت میں علمائے لغت یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں  
”وینکح الایام الیتامی“ اور وہ بیوہ اور یتیم عورتوں  
سے نکاح کرتا ہے

وقال ابو سعید: تلحق یتیمۃ ما لم تنزوج فاذا

الوسعید نے کہا ہے کہ عورت کو اس وقت تک یتیم کہہ کر

پکارا جاتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے پھر جب  
اس کی شادی ہو جائے تو یہی کالقب اس کے لئے باقی نہیں  
رہتا، اس کے ثبوت میں مفصل یہ شعر پیش کیا کرتے تھے۔

”اے فاطمہ! میں مرد ہوں، لہذا تم صبر و ضبط سے کام لینا اور  
گریہ و زاری نہ کرنا جو تین تو سب کی سب تیمم ہی ہو اگر تیری“  
..... حدیث میں آیا ہے کہ ”تیمم لڑکی سے (اس کے نکلنے  
کے وقت) اس کی مرضی معلوم کی جائیگی پھر اگر وہ خاموش  
رہے تو اس کی خاموشی کو رضا مندی سمجھا جائیگا، تیہاں تیمم  
سے مراد کنواری جوان لڑکی ہے جس کے والد کا انتقال  
ہو چکا ہو چنانچہ تیمم کا نام اس کے ساتھ برابر لگا رہا حتیٰ کہ  
جوان ہو جائے کے ہی سہی اس کو حدیث میں تیمم ہی فرمایا گیا  
ہے۔ علاوہ ازیں شعبی کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور  
اس نے عرض کیا کہ ”میں ایک تیمم عورت ہوں“ تو اس پر آپ کے صحابہ  
کو ہنسی آگئی (کہ اتنی بڑی عورت ہو کر وہ اپنے آپ کو تیمم کہہ رہی ہے)  
تو آپ نے فرمایا کہ عورتیں سب کی سب تیمم ہوتی ہیں، آپ کا اس  
پر مطلب تھا کہ وہ سب کی سب کمزور ہوتی ہیں..... حضرت عمرؓ  
کی حدیث میں آیا ہے کہ خفاف عفارسی کی لڑکی نے آپؐ کو عرض  
کیا تھا کہ میں ایک تیمم عورت ہوں، میرا شوہر مر گیا ہے۔

تزوجت نزل عنہا اسم الیتیم۔ وکان  
المفضل ینشدہ

افاطمہ انی ہالک فتبتی  
ولا تجزعی کل النساء یتیمہ  
..... وفي الحدیث تستأمر الیتیمۃ فی نفسہا  
فان سکتت فہو اذ نھا۔ اراد بالیتیمۃ البکر  
الیا لغۃ التی مات الوھا قبل بلوغہا  
فلزمہا اسم الیتیمۃ فدعیبت بہ  
وہی بالغۃ۔ وفي حدیث الشعبي ان  
امرأۃ جاءت الیہ فقالت انی  
امرأۃ یتیمۃ فضحک اصحابہ فقال  
النساء کلھن یتامی ای صنعاً لف  
..... وجاء فی حدیث عمر رضی اللہ  
عنہ قالت لہ بنت خفاف العفارسی  
انی امرأۃ مؤتمۃ توفی زوجی

[راج العروس من جہا القاموس ج ۹ ص ۱۱۳]

مطبوعہ مطبعہ خیریر جمالیہ مدرسہ ۱۳۱۷ھ

نیز امام علامہ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی (المتوفی ۱۱۷۱ھ) اپنی مشہور لغت

لسان العرب میں مندرجہ بالا تصریحات درج کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

یتیمہ، بہ ضمہ بارہ دفعہ کے اصل معنی اکیلا ہونے کے ہیں۔

دوسرا قول یہی ہے کہ اس کے اصل معنی خففت کے ہیں۔

مواصل الیتیمہ بالضم والفتح الانفراد و

قیل الغفلة والانشی یتیمۃ واذا بلغنا زال

عورت کو "یتیمہ" کہتے ہیں۔ مرد و عورت جب بالغ ہو جائیں تو حقیقی معنی کے اعتبار سے ان سے یتیمی کا لقب دور ہو جاتا ہے لیکن مجازاً ان دونوں کو بلوغ کے بعد بھی یتیم کہا جاتا ہے جیسا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا ہو جانے کے بعد بھی "یتیم ابی طالب" کہا کرتے تھے کیونکہ اہل طالع آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش کی تھی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ یتیم عورت سے اس کے نفس کے دلہنح کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائے پھر اگر وہ خاموش رہے تو اسے اس کی اجازت سمجھا جائے۔ اس حدیث میں یتیمہ سے مراد کنواری بالغ لڑکی ہے جس کا باپ اس کے بالغ ہونے سے پہلے مر گیا ہو، پھر یتیمی کا لقب اس کے ساتھ لگا رہا اور بالغ ہونے کے بعد بھی مجازاً اسے یتیم ہی کہہ کر پکارا گیا ہے۔

یتیم کے یہ معنی محض لغوی ہی نہیں ہیں جسے علمائے لغت ہی نے بیان فرمایا ہو بلکہ یہ ایسے معنی ہیں جسے ہمارے اکابر فقہار نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ حجتہ الاسلام امام ابو بکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ فرماتے ہیں۔

یزید ابن ہریر نے روایت کی ہے کہ نجد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لکھ کر دریافت کیا تھا کہ یتیم سے یتیمی کا نام کب ختم ہو جاتا ہے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سجدہ کو جواب میں لکھا تھا کہ کجب اس سے رشد (معاملات کی سوجھ بوجھ) محسوس ہونے لگے تو پھر اس کو یتیم نہیں کہیں گے۔ اور بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ آدمی کی ڈاڑھی ایک مٹھی کے برابر ہو جاتی ہے مگر اس سے یتیمی کا لقب دور نہیں ہوتا۔ تو اس روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد

عنها اسم الیتیم حقیقة وقد یطلق علیہما مجازاً بعد البلوغ کہا کا لوزا یسمرن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو کبیر یتیمہ ابی طالب لانه و باہ بعد وفات ابيه وفي الحدیث تستأمر الیتیمہ فی نفسہا فان سکتت فہو اذنها اس اذ بالیتیمہ البکر البالغۃ التی مات ابوہا قبل بلوغہا فلزمها اسم الیتیمہ فدعیبت بہ وہی بالغۃ مجازاً

لسان العرب ج ۱۶ ص ۱۳۲-۱۳۳

(مطبوعہ مطبعہ کبریٰ بیروت بولاق مہر ۱۳۳۰ھ)

وقدر وی یزید ابن ہریران نجد تہ کتب الی ابن عباس یسئلہ عن الیتیمہ متی یقطع یتیمہ فکتب الیہ اذا ولس منہ الرشدا انقطع عنہ یتیمہ وفي بعض الالفاظ ان الرشدا لیتقبض علی لحيته ولم یقطع عنہ یتیمہ بعد فاخبر ابن عباس ان اسم الیتیمہ قد یلزمہ بعد البلوغ اذا لم یستحکم رأیہ ولم یؤلس منہ رشدا فہو یجمل بقعاء

بھی اگر آدمی کی رائے میں استحکام پیدا نہ ہو اور معاملات کی سوچ بوجھ کا انداز نہ ہو سکے تو ایسے آدمی پر یتیمی کا لقب برابر برقرار رہتا ہے لہذا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ضعف رائے کے باقی رہنے کو یتیمی کے لقب کے برقرار رہنے کا موجب قرار دیا ہے یتیم کا لفظ اس آدمی پر بھی بولا جاتا ہے جو اپنے اپنے شوہر سے الگ رہ گیا ہو اور اس عورت پر بھی بولا جاتا ہے جو اپنے شوہر سے الگ رہ گئی ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یتیم لڑکی سے اس کے اپنے نفس کے بارے میں (نکاح کے وقت) مرضی معلوم کی جائے۔ اور یتیم لڑکی سے اس کی مرضی اسی وقت معلوم کی جاسکتی ہے جبکہ وہ بالغ ہو چکی ہو۔ شاعر نے کہا ہے

درحقیقت قبر میں ہی برائوں یعنی بے سہارا یتیم عورتوں کا نکاح کراتی ہیں کہ ان کے شوہر فوت ہو کر قبروں میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کا قبروں میں پہنچ جانا ان عورتوں کے دوسرے نکاح کا سبب بن جاتا ہے (شاعر نے اس شعر میں بڑھ جان عورتوں کو یتیمی کہا ہے، لیکن یہ بات معلوم ہے کہ مرد جب بوڑھا یا ادھیڑ ہو جاتا ہے تو اسے یتیم نہیں کہتے خواہ وہ کتنا ہی ضعیف العقل اور ناقص الرائے کیوں نہ ہو۔ لہذا مرد کے سلسلہ میں اس کا بچپن کی عمر سے قریب العہد ہونا یتیم کہلانے کے لئے ضروری ہے لیکن بڑی بوڑھی سن رسیدہ عورت کو یتیمہ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ شوہر سے الگ رہ گئی ہے جبکہ بڑے بوڑھے سن رسیدہ مرد کو اس اعتبار سے یتیم نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنے باپ سے الگ رہ

ضعف الرأی موجب البقاء اسم الیتیم علیہ واسم الیتیم قد یقع علی المنفرد عن ابیہ وعلی المسرأة المنفردة عن زوجها۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تستأمر الیتیم فی نفسہا ولھی لا تستأمر الا ولھی بالغة وقال الشاعر

ان القبور تنکح الایامی

النسوة الارامل الیتامی

الا انه معلوم انه اذا صار شیخا او کھلا لایسبی یتیمًا وان کان ضعیف العقل ناقص الرأی فلا بد من قرب العهد بالصغر والمرأة الکبيرة المسنة تسمى یتیمة من جهة افرادھا عن زوج والرجل الکبیر المسن لایسبی یتیمًا من جهة افرادہ عن ابیہ واما کان کذلک لان الایامی علی الصغیر ویدبر امرہ ویحوطہ نیکفہ تسمى الصغیر یتیمًا لافراخہ عن ابیہ الذی ہذا حالہ فمادام علی حال الضعف وناقص الرأی یسبی یتیمًا بعد البلوغ واما المرأة فانھا

سميت يتيمة لانفراوها عن الزوج الذي  
 هي في حباله وكفنه نهي وان كبرت  
 فهذا الاسم لازم لها لان وجود الزوج  
 لها في هذه الحال بمنزلة الاب للصغير  
 في انه هو الذي يولي حفظها وحياتها  
 فاذا انفردت عن هذه حاله معها  
 سميت يتيمة كما سمي الصغير يتيما  
 لانفراوه عن يد بر امره ويكفنه ويحفظه  
 الاتي الى قوله تعالى "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ  
 عَلَى النِّسَاءِ" كما قال : وَأَنْ تَقْرَأُوا لِلْيَتَامَى  
 بِالْقِسْطِ لَجْعَلِ الرَّجُلُ تَيْمًا عَلَى امْرَأَتِهِ  
 كما جعل ولي اليتيم قیما علیہ

(احکام القرآن ص ۵۰-۵۸ ج ۲)

مطبوعہ مطبعہ بیہ مصریہ - ۱۳۲۴ ہجریہ

گیا ہے۔ اس لئے ہے کہ باپ عموماً چھوٹے بچے کا ولی ہوتا  
 ہے۔ وہی اس کے معاملات کا انتظام کرتا اور اس کی  
 حفاظت و وصیانت کا فرض انجام دیتا ہے۔ لہذا چھوٹے  
 بچے کو یتیم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے اس باپ سے الگ  
 رہ گیا ہے جس کی صورت یہ تھی۔ پھر یہ بچہ جب تک حالت  
 ضعف اور نقصان عقل و راستے پر مانع ہونے کے بعد  
 بھی قائم رہے اسے یتیم ہی کہا جائیگا۔ لیکن عورت کو  
 اس لئے یتیمہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اس شوہر سے الگ  
 رہ جاتی ہے جس کے وہ نکاح اور حفاظت میں تھی۔ لہذا  
 بڑی ہو جانے کے بعد بھی یہ لقب برابر اس کے ساتھ لگا  
 رہتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں شوہر کا وجود بعینہ ویسا  
 ہی ہے جیسا کہ چھوٹے بچے کے لئے اس کے باپ کا وجود  
 ہوا کرتا ہے کیونکہ شوہر ہی عورت کی حفاظت و وصیانت کا  
 ذمہ دار ہوتا ہے لہذا جب وہ اپنے شوہر سے الگ رہ جائے  
 جس کی صورت یہ کچھ تھی تو عورت کو یتیمہ کہا جائیگا  
 جیسا کہ چھوٹے بچے کو اس وجہ سے یتیم کہا جاتا تھا کہ وہ  
 اس بہتی سے الگ رہ گیا ہے جو اس کے معاملات کا  
 انتظام کرتی اور اس کی حفاظت و وصیانت کا فرض  
 دیتی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں  
 مردوں کو عورتوں کا کفیل اور نگران بتایا ہے جیسا کہ دوسرے  
 جگہ لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ یتیموں کی کفالت اور نگرانی  
 انصاف کے ساتھ کریں تو جس طرح یتیم کے ولی کو یتیم

اپنی بیوی کا کفیل اور نگراں بتایا ہے۔

علمائے لغت اور اکابرین فقہ کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ یتاھی کے مفہوم میں وہ جوان اور غیر شادی شدہ لڑکیاں جن کے باپ مر گئے ہوں اور وہ لڑکیاں جن کے باپ اور شوہر اس دنیا میں موجود نہ رہے ہوں سب ہی شامل ہیں۔ اسی کی وضاحت سورہٴ نساء کی ایک دوسری آیت سے بھی ہو جاتی ہے جس میں خود اسی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اور وہاں صرت یتاھی کا لفظ استعمال نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ یتاھی النساء کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ سورہٴ نساء کی اس آیت میں بھی یتاھی سے مراد یتیم عورتیں یتیم جوان ناکتخدا اور سیوہ لڑکیاں ہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

اور (اے پیغمبر اسلام) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں

خدا کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ خدا نہیں

عورتوں کے بارے میں (عدل و قسط کا) حکم دیتا ہے اور

وہ آیت بھی جو یتیم عورتوں اور کمزوروں کے بارے میں اکتساب

(قرآن کریم) میں تم پر تلاوت کی جاتی ہے (یعنی آیت ہے)

(عدل و قسط ہی کا) حکم دیتی ہے۔ وہ یتیم عورتیں جنہیں

تم وہ مہر کی مقدار تو ادا نہیں کرتے جو ان کے لئے مقرر کیا

گیا تھا اور ان سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہو اور

(خدا کا حکم دیتا ہے کہ) سب یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔

اور جو کچھ بھلائی تم کر گے تو وہ ضائع نہیں جائیگی) یقیناً

خدا اسے جاننے والا ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۗ قُلِ اللَّهُ

يُعْتَبِرْكُمْ فِيهِنَّ ۖ لَا وَمَا يُثَلَّىٰ عَلَيْكُمْ فِي

الْكِتَابِ فِي يَتَاهِي النِّسَاءِ الَّتِي لَا زَوْجَهُنَّ

مَا كَتَبَ لَهُنَّ وَتَرَعَبُونَ ۗ أَنْ

تَنْكحُوهُنَّ ۗ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوُلْدَانِ

وَأَنْ تَقْرُمُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا

مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا (پہ)

اس آیت کریمہ میں وَمَا يُثَلَّىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَاهِي النِّسَاءِ (اور وہ آیت جو یتیم عورتوں

کے بارے میں اکتساب میں تم پر تلاوت کی جاتی ہے) سے اشارہ اسی آیت کی طرف ہے جو یہاں زیر بحث

ہے اس کی تصریح خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں موجود ہے جو سورہٴ نساء کی آیت نمبر ۳ کے

شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے اور جس پر آگے بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم میں

اور کوئی دوسری آیت موجود نہیں ہے جس میں ان یتیم عورتوں کے متعلق کوئی حکم دیا گیا ہو۔ اس آیت کریمہ

میں وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّبَا كَالْعِطْفِ فِي يَتَاهِي النِّسَاءِ ہی پر ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۳ یعنی آیت زیر بحث میں یَتَاهٰی کا لفظ کمزور بچوں اور یتیم عورتوں (کنواری، جوان، بے باپ کی لڑکیوں اور بیوہ عورتوں) سب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ الْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا (قرآن کی بعض آیات دوسری قرآنی آیات کی تفسیر کر دیتی ہیں) مفسرین کا مسلمہ اصول ہے چنانچہ آپ نے اس مثال میں ملاحظہ فرمایا ہے کہ آیت نمبر ۱۲ نے کس طرح آیت نمبر ۳ کی تشریح فرمائی ہے۔

علاوہ ازیں خود آیت نمبر ۳ میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے کہ یَتَاهٰی سے قرآن کی وہاں کیا مراد ہے۔ آیت میں جن عورتوں اور لڑکیوں کو اَلِیْتَاهٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا انہی کو آگے چل کر النِّسَاءُ کہا گیا ہے (وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَقْسُطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ) پر الف ولام لانے سے مقصد ہی یہ ہے کہ ان عورتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جن کا ذکر یہ یَتَاهٰی کے ضمن میں پہلے آچکا ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس کی توضیح ایک کوئی مثال سے کر دی جائے جس میں اسی ہیئت ترکیبی (Construction) کو اختیار فرمایا گیا ہے۔ رمضان کے روزوں کے سلسلہ میں سورہ بقرہ میں فرمایا گیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ  
هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ  
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ  
فَلْيَصُمْهُ ۗ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ  
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کو نازل کیا گیا ہے، لوگوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کی واضح اور تمیز کن آیات پر مشتمل ہے۔ لہذا تم میں سے جو شخص اس مہینہ (مذکورہ) میں اپنے گھر پر ہودہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص مریض یا مسافر ہو تو وہ دوسرے دنوں اس کی گنتی پوری کرے۔

اس آیت میں دیکھئے الشہر میں الف ولام لایا گیا ہے لہذا اس سے مراد ہی مہینہ رمضان ہو گا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کوئی دوسرا مہینہ مراد نہیں ہو سکتا جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ الشہر پر الف ولام اس مہینہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو متعین ہے اور پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب رمضان کے دنوں کی گنتی دوسرے دنوں سے پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو چونکہ ان دوسرے دنوں کا پہلے ذکر نہیں آیا تھا اور وہ متعین نہیں تھے اس لئے من الايام مر الف ولام کے ساتھ نہیں کیا گیا بلکہ من ایام



کہا گیا ہے اور ساتھ ہی اُس کی قید بھی لگا دی گئی ہے۔ بعینہ اسی طرح اگر آیت زیر بحث میں متیم اور بیوہ عورتوں کے علاوہ کوئی دوسری عورتیں مراد ہوتیں تو اَلْبَتْلَاءِ (الف و لام کے ساتھ) نہ کہا جاتا بلکہ نِسَاءً کہا جاتا اور اس کے ساتھ اُس کی قید بھی لگائی جاتی۔ لہذا اگر آیت نمبر ۱۲۷ سے یہ توضیح نہ کر دی گئی ہوتی کہ آیت نمبر ۳ میں یتیم سے مراد جو ان (کنواری اور بیوہ) عورتیں ہیں تو خود آیت نمبر ۳ کی ہیئت ترکیبی بھی یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ یتیم سے قرآن کی کیا مراد ہے۔

یتیم کے لفظ کا یہ مفہوم عہد نبوی میں عام طور پر شائع و ذائع تھا چنانچہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں بار بار استعمال فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مشہور روایت ہے کہ

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم  
الثيب احق بنفسها من وليها والبكر تستأذن في نفسها واذا نهها صماتها  
ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
ارشاد فرمایا کہ بیوہ عورت اپنے ولی کے مقابلے میں اپنے نفس  
کی زیادہ حقدار ہے اور کنواری لڑکی سے بھی اس کے نفس  
کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائیگی اور اس کی خاموشی

(من وادع الجماعۃ الا البخاری)

کو اس کی اجازت سمجھا جائیگا۔

اس روایت میں جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے عام بیوہ اور کنواری لڑکیوں کے نکاح کے سلسلہ میں ہدایت دی گئی ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ بیوہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی معلوم کئے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ اس کے ولی کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہے اس کی شادی کر دے یہی حال بالغ کنواری لڑکی کا بھی ہے۔ البتہ بالغ کنواری لڑکی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زبان سے اپنی مرضی کا اظہار کرے۔ اگر ولی کے دریافت کرنے پر وہ خاموش رہے اور اذکار نہ کرے تو اس خاموشی کو اس کی رضا مندی سمجھا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہمارے فقہائے اہل سنت نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ لڑکی کی خاموشی کو رضا مندی اسی وقت سمجھا جائے گا جبکہ اجازت لینے والا لڑکی کا باپ ہو۔ اگر لڑکی کا باپ نہ ہو بلکہ کوئی اور ولی (چچا وغیرہ) ہو تو اس صورت میں اس کی خاموشی کو رضا مندی نہیں سمجھا جائے گا۔ یعنی دن کے نزدیک کنواری لڑکی سے مراد ایسی جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ بھی موجود ہے۔ لیکن بعینہ اسی روایت کو مسند احمد اور سنن نسائی میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔  
وَالْبَتْلَاءُ نِسَاءٌ ذُنَّ فِي نَفْسِهَا (احمد و نسائی) اور یتیم لڑکی سے اس نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم ہو جائیگی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عہد نبوی صلعم میں یتیمہ کے معنی وہی سمجھے جاتے تھے جو بکر کے معنی تھے۔ دونوں لفظوں کے معنوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ ایک لفظ کی جگہ یوں دوسرا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ ویسے ہمارے فقہائے کرام کے نزدیک بھی اس روایت میں یتیمہ سے مراد، جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ موجود ہو۔ کیونکہ سنن البراد اور سنن نسائی میں یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔

لیس للولی مع الثیب امرؤ والیتیمہ  
تستأمر، وصمتھا اقراں ہما  
یوہ لڑکی کے ساتھ اس کے ولی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور یتیم لڑکی سے بھی اس کی مرضی معلوم کی جائیگی۔ اور اس کی خاموشی کو اس کا اقرار سمجھا جائیگا۔  
(البراد اور نسائی)

اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک جوان کنواری لڑکی کی خاموشی کو اقرار اسی وقت سمجھا جاتا ہے جبکہ اجازت لینے والا اس لڑکی کا باپ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں ایسی لڑکی کو یتیمہ فرمایا گیا ہے جو جوان ہے، کنواری ہے، اور اس کا باپ بھی زندہ ہے۔ یعنی وہی باوجود علمائے لغت نے کہاں تھی کہ ہر عورت کو کوئی معنوں میں یتیم نہ ہونے کے باوجود بھی عربی زبان میں یتیمہ کہہ دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت البرموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال تستأمر  
الیتیمہ فی نفسھا فان سکتت فقد اذنت  
ان اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یتیم لڑکی سے اس کے نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائیگی پھر اگر وہ خاموش رہی تو اس نے اجازت دیدی اور اگر اس نے انکار کر دیا تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔  
(سواہ احمل)

اس روایت میں بھی یتیمہ سے مراد جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
تستأمر الیتیمہ فی نفسھا فان سکتت فہو  
اذنھا وان ابت فلا جوان علیھا  
ابوہریرہ، ہر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یتیم لڑکی سے اس کے نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائیگی پھر اگر وہ خاموش ہے تو یہ اس کی اجازت ہے اور اگر وہ انکار کرے تو اس پر جبر کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔  
(سواہ الخمسة الا ابن ماجہ) (۱)

(۱) ان تمام روایات کے لئے دیکھئے نیل الاوطار للشوکانی ص ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴ مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البانی الجلیڈ اولادہ بمصر ۱۳۴۲ھ

نہیں ہے (بخاری مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

اس روایت میں بھی یتیمہ سے مراد جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ بھی موجود ہے۔ ان تمام روایا سے ثابت ہے کہ عہد نبوی میں یتیمہ کا لفظ جوان کنواری لڑکیوں کے لئے عام طور پر لہرا جاتا تھا اور یہ لفظ بڑی حد تک بکڑ کا مراد سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام روایات سے علمائے لغت کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عربوں میں ہر عورت کو یتیمہ کہہ دیا جاتا تھا حتیٰ کہ ان عورتوں کو بھی جو عمری معنوں میں یتیم نہ ہوں۔ اس پوری تفصیل کے بعد غالباً سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ آیت مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں اور بچیوں کے علاوہ ناکتھدا جوان لڑکیاں اور بیوہ عورتیں بھی اس انداز سے پائی جائیں کہ بجز اس صورت کے کہ ان میں سے جن لڑکیوں اور عورتوں سے تم شادی کر کے انھیں اپنے خاندان کا جز بنا سکتے ہو بنا کو کسی اور طرح ان کے ساتھ سماجی و معاشرتی عدل و انصاف کا سلوک ہی نہ ہو سکتا ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے کہ ان عورتوں اور لڑکیوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں اور جن سے تم شادی کر سکتے ہو یعنی وہ تمہارے لئے حلال ہوں تو تم ان سے شادیاں کر لو۔ یہ شادیاں دو دو۔ تین تین چار چار کی تعداد میں بھی کی جا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ان متعدد بیویوں کے ساتھ تم برابر ہی کا سلوک کر سکو اور کسی کی حق تلفی نہ کرو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ برابر ہی کا سلوک نہیں کر سکو گے تو پھر تعداد از دواج کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں ایک ہی بیوی یا کنیز پر اکتفا کرنا چاہئے۔

ایسی صورت بعض ہنگامی حالات میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ مثلاً جنگ وغیرہ کی وجہ سے سوسائٹی میں مردوں کی تعداد کم ہو گئی ہو اور عورتوں کی تعداد بڑھ گئی ہو اور یتیم اور بیوہ عورتیں بے سہارا رہ گئی ہوں۔ اس قسم کی صورتیں جنگجو اقوام و قبائل میں ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ عرب معاشرہ اپنی جنگجوئی کی وجہ سے اپنی حالات سے دوچار تھا اور اسلام کے بعد ان حالات میں مزید شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ معاشرہ میں اس قسم کے عام حالات تو نہ ہوں لیکن بعض خاندانوں میں خصوصی طور پر ایسی صورتیں پیش آ سکتی ہیں جہاں یتیم اور بیوہ عورتوں کی پرورش و حفاظت کے لئے تعداد از دواج ناگزیر ہو۔ مثال کے طور پر نیکو بھائی عمر و فوت ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پیچھے جوان بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا ہے۔ بچوں کی پرورش اور عورت پر داخت کا تقاضا ہے کہ عمر و کی بیوی دوسری شادی نہ کرے لیکن خود

اس کی عمر اور جوانی کا تقاضا ہے کہ وہ دوسری شادی کرے۔ زید محسوس کرتا ہے کہ چچا ہونے کی حیثیت سے عمر کے بچوں کی کفالت اس کے ذمہ ہے اور وہی ان کی پرورش اور خورد و پرداخت کا ذمہ دار ہے لیکن زید کی بیوی ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت اس انداز سے نہیں کر سکتی جس انداز سے خود بچوں کی ماں کر سکتی ہے۔ اگر عمر کی بیوی نے دوسری شادی کر لی جس کا اسے حق ہے۔ اور اپنی عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر اسے کر لینی چاہئے تو بچوں کی سٹی خراب ہو جائیگی ایسی صورت میں اگر وہ خود اپنی بھادرج سے شادی کر لے تاکہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت مناسب طریقہ پر ہو سکے تو قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی رو سے ایسی صورت میں زید کو دوسری شادی کر لینے کا حق ہے اور اس پر کوئی بندش نہیں ہے۔ بہر حال بیویوں اور جو اؤں کی حفاظت و نگہداشت کے ارادہ سے اگر ایک سے زیادہ شادیاں کی جائیں تو قرآن کریم کی رو سے اس کی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی مقصد یا ارادہ سے عقد ثانی کی اجازت قرآن کریم نے نہیں دی۔

**آیت کی مروجہ تفسیر** قرآن کریم کی رو سے بات اس قدر واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے لیکن ہمارے مفسرین و مترجمین نے اس آیت کا وہ مطلب نہیں لیا جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں یہاں نمونے کے طور پر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ اور تفسیر نقل کرتے ہیں۔ باقی تمام مفسرین و مترجمین نے بھی اسی انداز کے ترجمے اور تفسیریں فرمائی ہیں۔ مولانا آزاد اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ

اور (دیکھو) اگر تم نکاح کرنا چاہو اور تمہیں اندیشہ ہو کہ تمہیں لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو (انہیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ بلکہ) جو عورتیں تمہیں پسند آئیں، ان سے نکاح کر لو (یعنی دوسری عورتوں میں) جو تمہیں پسند آئیں نکاح کر لو۔ ایک وقت میں) دو دو تین تین چار چار تک کر سکتے ہو۔ (بشرطیکہ ان میں انصاف کر سکو یعنی سب کے حقوق ادا کر سکو اور سب کے ساتھ یکساں سلوک کر سکو) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے، تو پھر چاہئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔

یہ عورتیں (دہائی کی قدروں میں سے) تمہارے ہاتھ آگئی ہیں (انہیں بیوی بنا کر

رکھی بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے (بہ نسبت اس کے کہ یتیم لڑکیوں کے حقوق کے لئے اللہ کے حضور حجاب وہ ہو)۔  
 اسی کے ساتھ وہ اپنے تفسیری نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ  
 (۳) ضمناً نکاح کا حکم کہ اگر ایک مرد استطاعت رکھتا ہو اور چاہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھے، تو چاہتا تک رکھ سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف کرے۔ یعنی سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ اگر اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکے گا، تو پھر ایک سے زیادہ نہیں کرنا چاہئے۔

(ترجمان القرآن ص ۳۲۵ جلد اول مطبوعہ دفتر ترجمان قرآن دہلی ۱۳۵۷ھ)

اسی آیت کریمہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں فرمایا ہے کہ

اور اگر ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں۔ دو دو تین تین۔ چار چار۔ پھر اگر ڈر ہو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کر دو یا نوٹھی جو اپنا مال ہے۔

اس آیت کے تفسیری نوٹ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ  
 احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ یتیم لڑکیاں جو اپنے ولی کی تربیت میں ہوتی تھیں اور وہ لڑکی اس ولی کے مال اور باغ میں بوجہ قرابت باہمی شریک ہوتی تو اب دو صورتیں پیش آئیں۔ کبھی تو یہ ہوتا کہ ولی کو اس کا جمال اور مال دونوں مرغوب ہوتے تو وہ ولی اس سے تھوڑے سے جہر پر نکاح کر لیتا کیونکہ دوسرا شخص اس لڑکی کا حق مانگنے والا تو کوئی ہے ہی نہیں اور کبھی یہ ہوتا کہ یتیم لڑکی کی صورت تو مرغوب نہ ہوتی مگر ولی یہ خیال کرتا کہ دوسرے سے نکاح کر دوں گا تو لڑکی کا مال میرے قبضہ سے نکل جائے گا اور میرے مال میں دوسرا شریک ہو جاوے گا۔ اس صلحت سے نکاح توجوں توں کر لیتا مگر منگوحہ سے کچھ رغبت نہ رکھتا۔ اس پر یہ آیت اتنی اور اولیا کو ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے اور ان کے جہر اور مال کے ساتھ حسنہ معاشرت میں

میں کو تاہی ہوگی تو تم ان سے نکاح مت کرو بلکہ اور عورتیں جو تم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ چار تک کی تم کو اجازت ہے۔ قاعدہ شریعت کے مطابق ان سے نکاح کر لو تاکہ یتیم لڑکیوں کو بھی نقصان نہ پہنچے کیونکہ تم ان کے حقوق کے حامی رہو گے اور تم بھی کسی خرابی اور گناہ میں نہ پڑو گے۔ جاننا چاہئے کہ مسلمان آزاد کے لئے زیادہ سے زیادہ چار نکاح تک اور عظام کے لئے دو تک اجازت ہے اور حدیثوں میں بھی اسی کی تصریح ہے اور ائمہ دین کا بھی اسی پر اجماع ہے اور تمام امت کے لئے بھی حکم ہے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور آپ کا امتیاز ہے کہ اس سے زائد کی اجازت ہے۔

(ترجمہ قرآن حضرت شیخ الہند ص ۹۹ مطبوعہ مدینہ پریس سجنور ۱۳۵۵ھ)

ہم ان تراجم و تفاسیر کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مولانا آزاد نے جو فرمایا ہے اور بن القوسین جس قدر عبارتیں اپنی طرف سے بڑھائی ہیں وہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے جس نے عبارت قرآنی کو ایسے معانی پہنچا دیے ہیں جو اصل عبارت کے بالکل ہی الٹ ہیں۔ اگر بن القوسین اضافہ شدہ عبارتوں کو حذف کر دیا جائے تو اصل ترجمہ بنتا ہے۔

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو۔ دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک کر سکتے ہو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے، تو پھر چاہئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔

اس ترجمہ میں ”تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں“ کی جگہ ”تو ان عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں“ کے الفاظ رکھ دیجئے۔ کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ النساء پر الف و لام ہونے کی وجہ سے نساء سے عام اور غیر متعین و غیر مذکور عورتیں مراد نہیں ہو سکتیں بلکہ وہی عورتیں مراد ہو سکتی ہیں جو متعین ہیں اور جن کا تذکرہ ضمناً پہلے آچکا ہے۔ اس معمولی سی تبدیلی کے بعد عورتوں فرمائیے کہ اس عبارت سے وہ مطلب نکالنا کہاں تک درست ہے جو مولانا آزاد نے نکالا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بسا عنینت ہے۔ لیکن اس میں بھی ”جو اور عورتیں“ کا لفظ قرآن کریم پر اضافہ ہے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ہے جس کا ترجمہ ”اور“ کے لفظ سے کیا جاسکے۔ صحیح ترجمہ ”ان میں سے جو عورتیں“ ہوگا۔ اس ذرا اسی تبدیلی کے بعد آپ خود عورتوں میں کہ قرآن کریم

کے یہ الفاظ اس پروردی تفصیل پر جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری نوٹ میں درج فرمائی ہے کس طرح منطبق ہو سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کوئی تصور ہے اور نہ حضرت شیخ الہند رحمہ کا اور نہ دیگر مفسرین و مترجمین کا۔ تصور اس اصول شکنی کا ہے جو اس سلسلہ میں سرزد ہو گئی ہے۔ تفسیر کا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر شان نزول کی روایات سے نہیں کی جاسکتی۔ ارباب اصول نے یہ بات متفقہ طور پر طے کر دی ہے کہ **أَلْعَبْرَةُ لِعُمْرِهِ الْأَلْفَاظُ لِأَخْصُوصِ الْمُؤْمِنِينَ**۔ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خصوصی شان نزول کا نہیں ہوتا۔ لیکن اصول نہ جانے کیوں یہاں نظر انداز ہو گیا ہے اور قرآن کریم کے الفاظ کو زبردستی کھینچ مان کر کے وہ معنی پہنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو شان نزول کے سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے سمجھ لئے گئے تھے۔ اس روایت پر ہم آئندہ چل کر کلام کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ جو معانی اس روایت سے سمجھ لئے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ لیکن پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ شان نزول کی روایات کی حیثیت کیا ہوتی ہے اور انہیں خود ارباب فن نے کیا اہمیت دی ہے چنانچہ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ

وایضا من المواضع الصعبة معرفة اسباب النزول. ووجه الصعوبة قیہا ایضا اختلاف المتقدمین والمتأخرین. والذي یظہر من استقراء كلام الصحابة والتابعین انهم لا يستعملون نزول فی کذا، المحض قصة كانت فی زمنه صلی اللہ علیہ وسلم. وھی سبب نزول الآية، بل ربما یذکرون بعض ما صدقت علیہ

اور اسباب نزول کی دریافت بھی مشکل مقامات میں ہے۔ اس میں بھی دشواری کی وجہ وہی متقدمین اور متأخرین کے درمیان اصطلاح کا اختلاف ہے صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقرانی مطالعہ سے جو بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ یہ ہے کہ وہ حضرات یہ آیت نلال واقعہ میں نازل ہوئی کے الفاظ ہمیشہ محض اس مقصد کے لئے استعمال نہیں کرتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا ہو اور جو آیت کے نازل ہونے کا سبب ہو، بلکہ اکثر یہی الفاظ وہ بعض ان باتوں کے لئے بھی بیان کر دیتے ہیں جن پر یہ آیت صادق آسکتی ہو

الایة مما كان فی زمنه صلی اللہ علیہ وسلم اذ بعدہ صلی اللہ علیہ وسلم ویقولون: نزلت فی کذا ولا یلزمہ هناک النطباق جمیع القیود، بل یکنی النطباق اصل المحکم فقط، وقد یقررون حادثۃ تحققت فی تلك الايام المبارکة واستنبط صلی اللہ علیہ وسلم حکمها من آية وقلها فی ذلك الباب ویقولون نزلت فی کذا در بما یقولون فی هذه الصورۃ فانزل اللہ قوله کذا انکا نه اشاره الی انه استنباطه صلی اللہ علیہ وسلم، والقاؤها فی تلك الساعة بخاطره المبارک ایضا نوع من الوحی والتفت فی الروع، فلذلك یمکن ان یقال: فانزلت، ویمکن ایضا ان یعبر فی هذه الصورۃ بتکرار النزول، ویزکر المحدثون فی ذیل آیات القرآن کثیرا من الاشیاء لیست من قسم سبب النزول فی الحقیقة، مثل استشهاد الصحابة فی مناظرهم

وہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی ہوں یا آپ کے بعد ہوئی ہوں، ان باتوں کے لئے بھی وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں تمام حدود و قیود کا منطبق ہونا ضروری نہیں ہو کر تاکہ صرف اصل حکم کا منطبق ہو جائے کئی کئی سمجھا جاتا ہے کبھی کبھی وہ کسی واقعہ کو بیان کر دیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ایام میں پیش آیا تھا اور آپ نے اس واقعہ کا حکم کسی قرآنی آیت سے استنباط فرما کر بیان فرمایا اور اس موضوع سے متعلق آیت کی تلاوت بھی فرمادی صحابہ تابعین ایسی صورت میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایسی صورت میں یہ کہہ گزرتے ہیں کہ "حق تعالیٰ نے اس سلسلہ میں اپنا فلاں قول نازل فرمایا" اس سے بھی غالباً اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استنباط ہی کی طرف ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کے قلب مبارک میں وہ آیت وارد ہو گئی کہ اس صورت کا حکم فلاں فلاں آیت سے نکالا جاسکتا ہے، یہ بھی ایک درجہ میں وحی اور القابہ ہی کی صورت ہے۔ لہذا ایسے موقوف پر یہ کہہ دینا ممکن ہے کہ "فلاں آیت اس واقعہ میں نازل ہوئی تھی" نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی صورت میں ان آیات کا دوبارہ نزول تسلیم کیا جائے۔ مجتہدین آیات، قرآنیہ کے ضمن میں بہت سی چیزیں نقل کر دیتے ہیں جو



درحقیقت اسباب نزل کی قسم سے نہیں ہوتیں مثلاً صحابہ نے اپنے مناظروں اور مباحثوں میں کسی آیت سے استدلال کیا یا آیت تلاوت کر دی جس سے مقصد اس آیت کو محض مثال میں پیش کرنا تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام شریف میں بطور دلیل کے کوئی آیت تلاوت فرمادی تھی یا صحابہ نے کوئی حدیث نقل کر دی تھی جو اصل غرض و رعایت میں آیت قرآنی کے موافق تھی یا انھوں نے نزل آیت کا مقام متعین کر دیا تھا یا ان ناموں کو متعین کر دیا تھا جن کا ذکر مبہم طریقہ پر کسی آیت میں آیا ہو یا کسی قرآن کے لفظ کا طریقہ تلفظ بیان کر دیا تھا یا سورتوں اور آیتوں کی فضیلت بیان کر دی تھی یا یہ بتا دیا تھا کہ احکام قرآن میں سے کسی حکم کا امتثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صورت سے فرمایا تھا اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی درحقیقت اسباب نزل میں سے نہیں ہوتی اور کسی مفسر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان سب باتوں کو یاد رکھے.....

میرے خیال میں یہ مناسب ہوگا کہ میں اس کتاب کے پانچویں باب میں تنقیح اور اختصار کے ساتھ

وہ اسباب نزل کی روایات نقل کر دوں جو امام بخاری امام ترمذی اور امام حاکم نے اپنی تفسیروں میں نقل فرمائی ہیں اور ان میں سے جو روایات مشکل ہیں ان کی توجیہ بیان کر دوں۔ یہ روایات عمدہ سند کے ساتھ یا تو صحابہ تک

بایۃ او تلاوتہ تمثیلہم  
بایۃ او تلاوتہ صلی اللہ علیہ  
وسلم ایۃ لا استشہاد فی  
کلامہ الشریف۔ اور راویۃ حدیث  
وافق الایۃ فی اصل الغرض، اوتعین  
موضع النزول، اوتعین اسماء المذکورین  
بطریق الابہام، اوبیان طریق  
التلفظ بکلمۃ قرآنیۃ ارفضل  
سور و آیات من القرآن اوصورۃ  
امتثالہ صلی اللہ علیہ وسلم  
بامر من او امر القرآن ونحو ذلک  
ولیس شیئ من هذا فی الحقیقۃ  
من اسباب النزول ولا یشرط  
احاطۃ المفسر بھذہ الاشیاء.....  
ومما یناسب عندی ان اذکر  
فی الباب الخامس ما نقل البخاری و  
الترمذی والحاکم فی تفاسیرھم  
من اسباب النزول و توجیہ  
المشکل بسند جید الی الصحابۃ  
اولی حضرتہ صلی اللہ علیہ وسلم  
بطریق التنقیح والاختصار لفائدتین:  
الاولی ان حفظ هذا القدس  
من الاثار لا ید منه للمفسر

پہنچتی ہیں یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ان تھوڑے سے آثار کو یاد کر لینا ہر مفسر کے لئے ضروری ہے جیسا کہ ان تشریحات کو یاد کر لینا بھی ضروری ہے جو قرآن کریم کے غریب الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں ہم نے بیان کی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اکثر اسباب نزول کے متعلق یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان میں سے بیشتر کآیات کے سمجھنے میں کچھ سبھی تو دخل نہیں ہے۔ بجز بہت تھوڑے سے ان قصوں کے جو ان تینوں تفسیروں میں نقل کئے گئے ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح ترین تفسیریں شمار ہوتی ہیں جہاں تا کہ محمد بن اسحق، واقدی اور کلبی کی زیادتیوں کا تعلق ہے کہ انھوں نے ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی قصہ بیان کر دیا ہے تو ان میں سے زیادہ تر صحیح نہیں ہیں اور ان کی سندات محل نظر ہیں۔ اور بڑی ہی ناحش غلطی ہے اگر ان روایات کو جاننا تفسیر کی شرائط میں سے شمار کیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب کی اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسباب نزول یا شان نزول کے سلسلہ میں دراصل متقدمین اور متأخرین کے درمیان اس اصطلاح کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔ حضرات متأخرین جس مفہوم میں ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، حضرات صحابہ و تابعین کے دور میں یہ الفاظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ ہذا شان نزول کی روایات کی وہ اہمیت نہیں سمجھنی چاہئے جو متأخرین نے اپنے ان متعین کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں دشواری یہ ہے کہ ہم دلیل میں الفاظ تو حضرات صحابہ اور تابعین کے پیش کرتے ہیں اور ان کو معنی وہ پہنات دیتے ہیں جو ہم نے خود اپنے ہاں متعین کر رکھے ہیں۔ حالانکہ ہمیں ان حضرات کے الفاظ کا وہی مفہوم

کمالا بد ما ذکرناہ من شرح غریب القرآن . والآخری ان یعلم ان اکثر اسباب النزول لا مدخل لها فی فہم معانی الآیات ، اللہم الاشیئ قلیل من القصص ینذکر فی ہذہ التفاسیر الثلثۃ ، التی ہی اصح التفاسیر عند المحدثین ، واما افراط محمد بن اسحاق والواقدی والکلبی وما ذکروا تحت کل آیۃ من قصۃ فاکثرہ غیر صحیح عند المحدثین ، وفی اسنادہ نظر ، ومن المخطأ البین ان یعد ذلک من شروط التفسیر

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر

(ص ۲۷-۲۸-۳۱)

مطبوعہ نور محمد۔ ص ۱۰ المطابع۔ کارخانہ تجارت

کتب۔ کراچی ۱۳۸۵ھ

لینا چاہئے جس میں وہ حضرات خود ان الفاظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے نہ کہ اپنا خود ساختہ مفہوم۔ اس تمہید کے بعد آئیے اس حدیث پر غور کریں جو آیت زیر بحث کے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے اور جس کی بنیاد پر آیت کا ترجمہ اور اس کی تفسیر میں وہ تعمرات کئے گئے ہیں جو آپ پہلے دیکھ چکے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ

حضرت عائشہ رضی کی روایت ہے کہ ان سے حضرت عدوہ نے عرض کیا کہ قول **وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَمْتِي** تانا **أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ** کے متعلق دریافت کیا تو حضرت عائشہ رضی نے فرمایا: بھائی! یہ وہ تمہیر ہے جو اپنے دل کی تربیت میں ہوتی تھی۔ دل کو اس کی خوبصورتی اور مال پسند آتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا حکم کر کے اس سے نکاح کرے انھیں ان لڑکیوں سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ ان کا پورا پورا مہر ادا کرنے میں وہ انصاف سے کام لیں اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح

کر لیں۔ حضرت عائشہ رضی نے فرمایا کہ اس کے بعد لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت کا حکم معلوم کیا تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **يَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ** آد **تَرْغِبُونَ أَنْ تُنْكَحُوهُنَّ** اور لوگوں کے لئے وضاحت فرمادی کہ تمہیر لڑکی جب خوبصورت اور مالدار ہوتی ہے تو لوگ اس سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر اس کا پورا مہر ادا کرنے میں روکا ہی کرتے

عائشہ: سألتها عروۃ عن قوله تعالى وان خفتم الا تقسطوا في اليمتي الى ان ما ملكت ايما نكم قالت يا ابن اختي هذا اليتيمه تكون في حجر وليها فيرغب في جمالها ومالها ويريد ان ينتقص صداقها فنهروا عن ذكاحهن الا ان يقسطوا. لهن في اكمال الصلح وامروا بنكاح من سواهن قالت عائشة فاستفتى الناس رسول الله صلى الله عليه وسلم فانزل الله تعالى يستفتونك في النساء الى وترغبون ان تنكحوهن فبين لهم ان يتيمه اذا كانت ذات جمال ومال رغبوا في نكاحها ولم يلحقوها بسنتها في اكمال الصلح واذا كانت مرغوبه عندها في قلة المال والجمال تركوها والتمسوا غيرها

ہیں) اور جتنا مہر اس کا ہونا چاہئے وہ اسے ادا نہیں کرتے اور جب اس کی دولت اور حسن میں کمی ہوتی ہے تو اس کی لوگوں کو رغبت نہیں ہوتی اور اُسے چھوڑ کر دوسری عورتیں تلاش کرتے ہیں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا جس طرح وہ اُسے بے رغبتی کی صورت میں چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح انھیں اس وقت بھی ان سے نکاح کرنے کا حق نہیں ہے جب انھیں ان کی طرف رغبت ہو مگر اس صورت میں کہ وہ ان کے لئے انصاف برتیں اور انھیں ان کے ہر کاپور اور راجح ادا کریں۔

دوسری روایت میں ہے کہ بھانجے! یہ وہ تمہارا کئی ہے جو اپنے دلی کی تربیت میں ہوتی تھی اور اس کے مال میں اس کی شریک ہوا کرتی تھی۔ دلی کو اس کا مال اور اس کی خوبصورتی پسند ہوتی تھی اور مہر کے سلسلہ میں انصاف برتے بغیر جو مہر اُسے دوسرے لوگ دے سکتے تھے اتنا ہی مہر وہ بھی دیدیتا۔ اس کے بغیر ہی وہ اس سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔ لہذا ان لوگوں کو ان سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ وہ ان سے انصاف کا برتاؤ کریں اور وہ ان کے درجہ (STATUS) کے بلند ترین مہر تک پہنچ جائیں کہ اس درجہ کی خواتین کا بلند ترین مہر جو کچھ ہو سکتا ہو وہ ان کو ادا کریں۔

اسی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تیلیٰ علیکم فی الکتاب وہ آیت جو قرآن میں تلاوت کی جاتی ہے) اس سے مراد

من النساء قال نکما تیرکونھا  
حین یرغبون عنھا فلیس لکم  
ان ینکحوا اولیٰ غبوا نیھا الا  
ان یقسطوا لھا ویعطروھا حقھا  
الاولیٰ من الصداق ۛ

دنی روایت: یا ابن اختی ہی  
الیتیمۃ تکون فی حجر ولیدھا تشارکہ  
فی مالہ فیعجبہ مالھا وجمالھا ویوید  
ان یتزوجھا بغیر ان یقسط فی  
صداقھا فیعطیھا مثل ما یعطیھا  
غیرہ فنکحوا عن نکاحھن الا  
ان یقسطوا لھن ویبغوا لھن  
اعلیٰ سنتھن من الصداق ۛ  
وفیہ: قالت والذی ذکر اللہ  
انہ یتلیٰ علیکم فی الکتاب  
الایۃ الاولیٰ التی قال فیھا وان  
خفتم الا تقسطوا فی الیتی فانکحوا  
ما طاب لکم قالت وهو قول اللہ  
تعالیٰ فی الایۃ الاخریٰ و یرغبون ان  
تکھن رغبتہ احدکم عن  
یتیمتہ التی تکون فی حجرہ حین تکون  
قلیلۃ المال فنکحوا ان ینکحوا ما رغبت  
مالھا وجمالھا من یتامی النساء

الا بالقسط من اجل رغبتهم  
عنهن ۛ للتيحين والى اورد والنسائي  
(جمع الفوائد من جامع الاصول والجمع الزوائد)  
للإمام محمد بن محمد بن محمد بن سليمان المتوفى سنة ۹۱۷هـ  
مطبوعه مطبعه خيريه ببلده ميرٹھ ۱۳۳۵ھ

پہلی آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَإِنْ حَفِظْتُمْ  
أَلَّا تَقْسِبُوا رِئِي أَيْتِي فَأَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ  
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اور وہی حق تعالیٰ کا قول ہے۔  
دوسری آیت میں کہ وَتَزَوَّجُوْنَ أَنْ تَنْكِحُوا لَهْنَ يَعْنِي  
جب لڑکی کم مالدار ہوتی ہے تو ولی کو جس کی تربیت میں  
وہ یتیم لڑکی ہوتی ہے اس سے بے رغبتی ہوتی ہے۔ لہذا  
ان کو ان یتیم عورتوں سے نکاح کرنے سے بھی روک دیا گیا  
جن کے مال اور خوبصورتی میں ان کو رغبت ہو کر تھی  
مگر یہ کہ وہ انصاف کا برتاؤ کریں۔ اس لئے کہ انہیں ان لڑکیوں  
سے کوئی رغبت نہیں ہوتی تھی (بلکہ ان کے مال اور خوبصورتی  
سے رغبت ہو کر تھی)۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ ان روایات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہیں بھی  
اس بات کی طرف اشارہ نہیں فرمایا ہے کہ سورہ نسا کی آیت نمبر ۳ یعنی وَإِنْ حَفِظْتُمْ أَلَّا تَقْسِبُوا  
رِئِي أَيْتِي والی آیت کا سبب نزول یا شان نزول یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی ناانصافی  
تھی کہ ان کے ادبیار کم مہر پر ان سے نکاح کر لیا کرتے تھے اور اس زیادتی کو روکنے کے لئے یہ آیت نازل  
ہوئی تھی بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اس قسم کی ناانصافیوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد صراحت کے ساتھ  
فَأَسْتَفْتِي النَّاسَ رِسْوَلِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى يَسْتَفْتُونَكَ  
فِي الْبَسَاءِ إِلَى وَتَزَوَّجُونَ أَنْ تَنْكِحُوا لَهْنَ (تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت کا  
حکم معلوم کیا تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَسْتَفْتُونَكَ فِي الْبَسَاءِ مَا تَزَوَّجُونَ أَنْ تَنْكِحُوا لَهْنَ  
فرما کر یہ بتا دیا ہے کہ وہ دراصل اپنی اس روایت میں سورہ نسا کی آیت نمبر ۱۳ کا شان نزول یا سبب  
نزول بیان فرما رہی ہیں۔

اس حدیث کا حاصل، جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ میں یتیم اور بیوہ عورتوں  
کا ایک مسئلہ موجود تھا اس کا حل پیش کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے سورہ نسا کی آیت نمبر ۳ نازل فرمائی

اور تعدد ازدواج کی اجازت دیکر لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ نکاح کر کے انھیں اپنے خاندانوں کا جز بنالیں تاکہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ ہو سکے چنانچہ جب اس آیت کے مطابق عمل درآمد شروع ہوا تو اس قسم کے واقعات بھی پیش آئے اور یہ واقعات پیش آنے بالکل قدرتی تھے کیونکہ معاشرہ میں بہر حال ہرزہ بنیت اور ہرجان کے لوگ ہوتے ہیں کہ اگر کوئی یتیم اور بیوہ عورت حسین اور اللہ دار نہ ہوتی تو اس سے خود نکاح کرنے سے کتراتے اور دوسری عورتیں نکاح کرنے کے لئے تلاش کرتے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب اس قسم کے واقعات لائے گئے تو آپ نے لوگوں کو اس سے منع فرمایا اور حکم صادر فرمایا کہ کوئی ولی اپنی زیر تربیت اور زیر کفالت یتیم اور بیوہ خاتون سے نکاح نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے میں ان یتیم اور بیوہ خواتین کی حق تلفی ہو رہی تھی اور یہ بات حکم خداوندی کے منشاء اور اس کی روح کے قطعاً خلاف تھی۔ ان یتیم اور بیوہ خواتین کو جلالہ عقد میں لانے کی اجازت تو اس لئے دی گئی تھی کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک ہو سکے اور ان کے حقوق کی حفاظت و وصیانت کی جاسکے۔ لیکن جب کچھ لوگوں نے اس حکم الہی کو بجائے ان عورتوں کی حفاظت و پاسداری کرنے کے ان کے حقوق غصب کرنے اور ان پر ظلم کرنے کا ذریعہ بنا لیا تو اس حکم میں تھوڑی ترمیم کر دی گئی۔ لہذا یہ حکم دیا گیا کہ اولیاء کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خود اپنی زیر کفالت خواتین سے شادیاں کریں۔ لوگوں کو ایسی یتیم اور بیوہ خواتین سے شادیاں کرنی چاہئیں جو خود ان کے زیر کفالت اور زیر تربیت نہ ہوں۔ زید ان خواتین سے شادی کرے جو زیر کفالت و تربیت ہوں اور عمر ان خواتین سے شادی کرے جو بکر کی کفالت تربیت میں ہوں تاکہ ان خواتین کے حقوق کی مکافہ حفاظت ہو سکے اور ان کے ساتھ عدل و قسط کا سلوک کیا جاسکے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اجتہادی فیصلہ تھا اور خود سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۳ ہی سے مستنبط تھا اور حرجت و حرجت درست تھا کیونکہ منشاء ربانی بھی اس آیت سے ہی تھا کہ ان خواتین کے ساتھ عدل و قسط کا سلوک کیا جائے۔ منشاء ربانی قطعاً یہ نہیں تھا کہ اس حکم یا اجازت سے ان خواتین کی مزید حق تلفی کی جائے۔ اس بات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے

فَنَهَوْنَا عَنْ بِنَاكِحِيْنَ اِلَّا اَنْ يُقْسَطُوْا لِهِنَّ فِيْ اَكْمَالِ الصَّدَقَاتِ وَاَمْرُوْا بِنِكَاحِ مَنْ سِوَا هُنَّ (تو لوگوں کو ان یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ وہ ان کا پورا پورا مہر ادا کرنے میں ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ

دوسری عورتوں سے (جو ان کے زیر کفالت نہ ہوں) شادی کر سکتے ہیں۔ یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور  
 اُمّ سُرَدِ ابِ بَصِیْمَہ مجبُول استعمال فرمایا ہے۔ یعنی یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان دونوں فعلوں کا فاعل  
 کون ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قطعاً ایسا کوئی اشارہ نہیں فرمایا کہ یہ ممانعت حق تعالیٰ نے آیت نمبر ۳۳ سے فرمائی  
 تھی۔ یا آیت نمبر ۳۳ سے حق تعالیٰ نے لوگوں کو ایسا کوئی حکم دیا تھا جس کی بنا پر ان واقعات کو اس آیت کا نشان  
 نزول قرار دیا جاسکے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا قرینہ موجود ہے کہ ان دونوں فعلوں کے فاعل جناب رسالت  
 مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے نہ کہ ذات خداوندی، یعنی یہ ممانعت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے  
 فرمائی تھی اور دوسری خواتین کے ساتھ نکاح کرنے کی ہدایت بھی آنحضرت صلی علیہ وسلم ہی نے دی تھی۔ اس  
 قرینہ کو ہم بعد میں بیان کریں گے۔

حدیث کے انداز بیان سے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ ممانعت بھی مختلف مراحل سے گذری تھی۔ ابتداً حضور  
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم اور یتیم عورتوں کے اولیاء کو قطعاً منع فرمایا ہوگا کہ وہ کسی صورت میں سبھی اپنی  
 زیر کفالت و قرابت خواتین سے شادیاں نہ کریں۔ اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں جب آپ نے محسوس فرمایا  
 ہوگا کہ اس عمل درآمد کی برائی اور قباحت بڑی حد تک لوگوں کے ذہن نشین ہو چکی ہے جس کے تدارک کے  
 لئے وہ ممانعت کی گئی تھی تو آپ نے اس بالکلید ممانعت کی طنائیں کچھ ڈھیلی کر دی ہوں گی اور لوگوں کو ان  
 خواتین کے ساتھ شادیاں کر لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دیدی ہوگی کہ انہیں وہ زیادہ سے زیادہ مہرا دیا  
 جائے جو ان کا جو سکتا ہو، تاکہ اس بات کا اچھی طرح اطمینان ہو جائے کہ شادیاں کرنے والوں کی نیت میں ان خواتین  
 کی حق تلفی کرنے کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ اسی بات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ان الفاظ  
 سے بیان فرمایا ہے کہ **اَلَا اَنْ يُقْسَطُوا لَهَا وَ يُعْطَوْهَا حَقَّهَا الْاَوْ فِي اَمْنٍ الشَّدَاتِ** (مگر یہ کہ وہ  
 ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں اور انھیں ان کے ہر اکمحل ترین (حَقَّهَا الْاَوْ فِي) ادا کریں) اور اسی  
 بات کو دوسری مرتبہ ان الفاظ سے واضح فرمایا ہے کہ **اَلَا اَنْ يُقْسَطُوا لَهَا وَ يُبْلَغُوا لَهَا حَقُّهَا اَوْ فِي اَمْنٍ**  
**حَقُّ الشَّدَاتِ** (مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں اور ان کے لئے ان کے درجہ (STATUS) کے  
 مطابق بلند ترین مہر تک پہنچ جائیں کہ ان کے درجہ کی خواتین کا جو بلند ترین مہر ہو سکتا ہو وہ ان کو ادا کریں)۔  
 اس قسم کے سخت قوانین ہمیشہ ہنگامی ہوا کرتے ہیں اور وقتی مصالح کو پورا کرنے کے لئے نافذ کئے  
 جاتے ہیں۔ اور جب یہ وقتی مصلحتیں اور ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو ان کو واپس لے لیا جاتا ہے۔ اس قسم

کے سخت ہنگامی قوانین سے عام لوگوں کو دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کو جن کی نیتوں میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہی کچھ اس قانون کے سلسلہ میں بھی ہوا ہوگا۔ اور لوگوں نے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہ آئندہ ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئیگی جس سے ان خواتین کی کوئی حق تلفی کا اندیشہ ہو ورنہ خواست کی ہوگی کہ اس قانون میں نرمی فرمائی جائے۔ چنانچہ اس کے بعد آیت نمبر ۱۲ نازل ہوئی اور اس حکم میں اتنی نرمی اور فرمادی گئی کہ زیادہ سے زیادہ۔ بلند ترین اور مکمل ترین جہاد کرنے کی پابندی نہیں رکھی گئی بلکہ محض عدل و قسط کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنے کی تاکید فرمائی گئی۔ یعنی انصاف کی رو سے جس قدر ان کا مناسب مہر ہونا چاہئے اتنا مہر ان کو ادا کر دینے کے بعد ان کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دیدی گئی۔

حدیث مذکورہ بالا پر ایک مرتبہ اور نظر ڈال لیجئے اور اس کے بعد سورہ نساء کی ان دونوں آیات کریمہ پر بھی دوبارہ غور فرمائیے اور دیکھئے کہ آیت نمبر ۳ کا یہ منشاء، بہرگز نہیں تھا کہ لوگ چونکہ ان یتیم اور بیوہ عورتوں سے جو ان کے زیر تربیت و کفالت ہوا کرتی تھیں چونکہ کم مہر پر شادیاں کر لیتے تھے اور انھیں ان کا پورا حق مہر ادا نہیں کرتے تھے لہذا اس عملی کو روکنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی گئی ہو اور ان سے کہا گیا ہو کہ وہ ان یتیم اور بیوہ عورتوں کے بجائے دوسری عورتوں سے شادیاں کریں۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر آیت نمبر ۳ واقعی اسی سلسلہ میں نازل ہوئی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں نھو اور اصرار کے لحاظ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد یہ ہوتا کہ لوگوں کو ان خواتین کے ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت اور دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کی ہدایت اسی آیت نمبر ۳ سے فرمائی گئی تھی۔ اور یوں یہ ممانعت اور ہدایت خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی تو واقعات کی کڑیاں درست نہیں بیٹھتیں۔ آپ

نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں دیکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق یہ استثنا آیت نمبر ۳ کی ممانعت کے ساتھ سچی موجود تھا کہ اگر ان خواتین کو ان کا پورا پورا مہر ادا کرنے میں عدل و قسط سے کام لیں تو وہ ان سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فَتَنْهَوْنَ عَنْ نِكَاحِ حَتَّىٰ إِذَا أُتُوا بِمَنْ لَمْ يَكُنْ فِي الْأَمْوَالِ الصَّدَاقِ (چنانچہ لوگوں کو ان کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر یہ کہ وہ ان کے لئے مہر کو پورا کرنے میں عدل و قسط سے کام لیں) یعنی اس آیت کی رو سے بالکل بندش نہیں لگائی گئی تھی بلکہ بندش محض اس صورت میں تھی کہ اگر لوگ ان خواتین کو پورا پورا مہر ادا نہ کریں تو وہ ان سے شادیاں نہ کریں بلکہ دوسری عورتوں سے شادیاں کریں اور اگر وہ ان کو ان کا پورا مہر ادا کریں تو پھر وہ خود ان خواتین سے بھی شادیاں کر سکتے ہیں۔ لہذا لوگوں نے



اس حکم میں دشواری محسوس کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت باہر کت میں خدا کا حکم معلوم کرنے کے لئے فتوے طلب کرنے شروع کر دیئے۔ اور اس کے نتیجے میں حق تعالیٰ نے آیت نمبر ۱۲ نازل فرمائی اور پہلے حکم ہی کی پھر تکرار فرمادی گئی چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق وہی استثنا پھر دہرائی گیا کہ  
 اَلَا اَنْ يُقْسَطُوا لَهَا وَيُعْطَوْهَا حَقَّهَا اَلَا فِي مِثْلِ الصَّدَاقِ (مگر یہ کہ وہ ان کے لئے عدل و قسط کا برابر تاؤ کریں اور انہیں ان کے مہر کا مکمل ترین حق ادا کر دیں) پہلے بھی عدل و قسط کے ساتھ ان سے نکاح کر لینے کی اجازت تھی اور اب بھی وہی اجازت اَلَا فِي مِثْلِ (مکمل ترین) کی قید کے ساتھ بحال رکھی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی تبدیلی عمل میں آئی تھی جس کی وجہ سے حق تعالیٰ کو یہ دوسری آیت نازل فرمائی پڑھی۔ جو حکم اس آیت نمبر ۱۲ سے دیا گیا ہے، اس حکم کے لئے تو پہلی آیت نمبر ۳ ہی کافی تھی، اس کو صحیحہ کے مطابق آیت نمبر ۱۲ نے قطعاً کوئی نیا فائدہ نہیں دیا۔ بلکہ اسی حکم کو دہرایا گیا ہے جو آیت نمبر ۳ میں دیا گیا تھا۔ اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ نُكُوهَا اور اُجْرُوَا سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ نہیں ہے کہ یہ امر اور نہ ہی آیت نمبر ۳ حاصل ہوئے تھے۔ دراصل یہی اس بات کا قرینہ ہے کہ مخالفت کرنے والی اور حکم دینے والی ہستی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جن تعالٰی کی ذات نہیں ہے۔ یہ مخالفت آپ نے آیت نمبر ۳ کی روح اور منشاء کو سامنے رکھا کہ خود اپنے اجتہاد سے دی تھی کیونکہ اس حکم کا منشاء یتامی کے حقوق کی حفاظت اور پاسداری تھا۔ ان کو غضب کرنا نہیں تھا۔ جب خود اسی حکم سے یتامی کے حقوق کو غضب کرنے کا کام لیا جائے گا تو اس میں اتنی ترمیم ضروری ہوگی کہ تعدد و اندواج کی اجازت تو ہے۔ لوگوں کو یتیم اور بیوہ عورتوں سے شادیاں بھی کرنی چاہئیں۔ لیکن ایسی بیوہ اور یتیم عورتوں سے شادیاں نہیں کرنی چاہئیں جو خود ان کی اپنی کفالت اور تربیت میں ہوں بلکہ ان سے شادیاں کرنی چاہئیں جو دوسرے لوگوں کی کفالت اور تربیت میں ہوں۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اول تو یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ سبب نزول یا شان نزول کی روایات کو اس قدر اہمیت دی جائے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو اس کے شان نزول پر فٹ کرنے کے لئے اس میں اس قسم کے ناپسندیدہ اضافات اور تصرفات کئے جائیں جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت (یعنی اس کے لئے) میں کئے گئے ہیں۔ پھر اب یہ سمجھ رکھیں کہ حضرات صحابہ اور تابعین

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں شان نزول کا وہ مطلب نہیں ہوا کرتا تھا۔ جو بعد میں علمائے متاخرین کے ہاں متعارف ہونا چلا گیا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک شان نزول کا مطلب صرف اتنا ہی ہوا کرتا تھا کہ وہ مثال کے طور پر کسی ایک واقعہ کو بیان کر دیتے تھے جس پر وہ آیت صادق آسکتی ہو اور اس کا حکم منطبق ہو سکتا ہو تاکہ سننے والے کو آیت کا مطلب سمجھنے میں کسی قدر سہولت ہو جائے۔ وہ بسا اوقات ایسے واقعات کو بھی شان نزول ہی کی حیثیت سے بیان کر دیتے تھے جن کا اس آیت کے نزول سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا البتہ جب کوئی واقعہ پیش آتا اور صحابہ میں سے کوئی صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا شرعی حکم معلوم کرتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی قرآنی آیت سے استنباط فرما کر اس کا حکم بتلاتے اور دلیل میں وہ آیت بھی تلاوت فرمادیتے جس سے آپ نے وہ حکم استنباط فرمایا تھا تو حضرات صحابہ اس واقعہ کو بھی شان نزول ہی کی حیثیت سے بیان کر دیتے تھے اور ان کا مطلب اس سے بھی صرف اتنا ہی ہوتا تھا کہ اس مثال کو سامنے رکھ کر لوگ اس آیت کریمہ کے مضمرات کو سہولت کے ساتھ سمجھ سکیں کہ یہ آیت کس نوعیت کے واقعات پر منطبق ہو سکتی ہے۔ لہذا کسی شان نزول کی روایت کو پیش کر کے قرآنی قیوت کو یوں جھکے بند کرنا درست نہیں ہے جیسا کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۳ کے سلسلہ میں ہمارے مترجمین و مفسرین نے کیا ہے۔

اس کے بعد آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جس شان نزول والی روایت کی بناء پر آیت میں وہ بیجا تصرفات فرمائے گئے تھے، وہ روایت بھی سورہ نساء کی آیت نمبر ۳ کا شان نزول بیان نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ آیت نمبر ۱۲ کا شان نزول بیان کر رہی ہے۔ نیز اس روایت میں فُھُوا اور مَھْرُوا سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ نہی (مانعت) اور امر (حکم) آیت نمبر ۳ سے حاصل ہوا تھا، جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ سورہ نساء کی پہلی آیت کے نازل ہونے کے بعد جب اس قسم کی زیادتیاں ہونے لگیں کہ لوگ ان یتیم اور بیوہ عورتوں سے جو خود ان کی کفالت اور تربیت میں ہوتی تھیں، اگر وہ خوبصورت اور مالدار ہوتیں، تو کم سے کم ہر چران سے خود نکاح کر لیتے اور اگر وہ خوبصورت اور مالدار نہ ہوتیں تو ان کی طرف وہ کوئی توجہ نہ کرتے بلکہ ایسی صورت میں وہ دوسری عورتوں کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ جب ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں اس قسم کے

واقعات آئے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی لوگوں کو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔ کیونکہ ایسا کرنا دراصل خود اس حکم کی روح اور اس کے منشاء کے خلاف تھا جو سورہٴ نسا کی آیت نمبر ۳۴ سے دیا گیا تھا۔

لہذا اس روایت میں کوئی ایسی چیز بیان نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں آیت کا منشاء اور مطلب متعین کرنے میں اپنی طرف سے ایسے الفاظ بڑھانے پر مجبور ہونا پڑے جو خود قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اس آیت کی تفسیر اور ترجمہ میں جو ”دوسری عورتوں“ یا ”دو عورتوں“ کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے وہ قطعاً غیر ضروری بلکہ نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ اس آیت کریمہ کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اگر معاشرہ میں چھوٹے چھوٹے یتیم بچے اور بچیاں، ناکتہ راہ یتیم جو ان لڑکیاں اور بیوہ عورتیں اس انداز سے پائی جاتی ہوں کہ بجز اس صورت کے کہ ان میں سے شادی کے لائق یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں سے شادیاں کر کے تم انھیں اپنے گھرانے کا ایک فرد بنا لو کسی اور طرح ان کے ساتھ سماجی اور معاشرتی عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکتا ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے کہ ان میں سے جو تمہیں پسند ہوں اور جو تمہارے لئے حلال ہوں تم ان سے شادیاں کر لو۔ یہ شادیاں دو دو۔ تین تین۔ چار چار کی تعداد میں کی جاسکتی ہیں۔ بشرطیکہ ان متعدد بیویوں کے ساتھ تم برابر ہی کا سلوک کر سکو اور کسی کی حق تلفی نہ کرو۔ لیکن اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ برابر ہی کا سلوک نہیں کر سکو گے تو پھر تعداد و زوج کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

(باقی آئندہ)